اسلام کا خوف اور دہشت کا راج

ایس پرویز منظور

[یہ ایک تبصراتی مقالہ ہے۔اس میں سات کتب کے مباحث پر تبصرہ اور تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔]

زیر تبصرہ کتب:

○ ORIENTALISTS, ISLAMISTS AND THE GLOBAL PUBLIC SPHERE: A GENEALOGY OF THE MODERN ESSENTIALIST IMAGE OF ISLAM.

(مستشرقین، اسلام پسند اور عالمگیر عوامی حلقہ: اسلام کی ناگزیریت کے جدید تصور کے ارتقاء کا ماخذ)

By Dietrich Jung. Equinox Publishing Ltd., 2011. Pp. 323. ISBN: 9781845539009.

○ POSTMODERN IMPERIALISM: GEOPOLITICS AND THE GREAT GAME.

(مابعد جدید سامراجیت: جغرافیائی سیاست اور بڑے پیمانے کی چالیں)

By Eric Walberg. Clarity Press, Inc. Atlanta GA, 2011. Pp. 300. ISBN: 978 0983353966.

○ FROM THE RUINS OF EMPIRE: THE REVOLT AGAINST THE WEST AND THE REMAKING OF ASIA.

(سلطنت کے کھنڈرات سے: مغرب کے خلاف بغاوت اور ایشیا کی تعمیر نو)

By Pankaj Mishra. Penguin Books, 2012. PP. 341. ISBN: 9780141970165.

○ THE LIBERAL DEFENCE OF MURDER.

(قتل کا فراخدلانہ دفاع)

By Richard Seymour. Verso, London, 2008. Pp. 358. ISBN: 9781844672400.

○ ARE MUSLIMS DISTINCTIVE? A LOOK AT THE EVIDENCE.

(کیا مسلمان مختلف ہیں؟ ثبوت کا جائزہ)

By M. Steven Fish. Oxford University Press, 2011. Pp. 385. ISBN: 9780199769216.

○ UNDER THE DRONES: MODERN LIVES IN THE AFGHAN-PAKISTAN BORDER LANDS.

(ڈرون طیاروں کے سائے تلے: افغانستان اور پاکستان کے سرحدی علاقوں میں جدید زندگی)

Ed. By Shahzad Bashir and Robert D. Crews. Harvard University Press, 2012. Pp. 336. ISBN: 97806740655611.

○ ON UTφYA: ANDERS BREIVIK, RIGHT TERROR, RACISM AND EUROPE.

(یوٹویا پر: اندرس بری وک، اصل دہشت گرد، نسل پرستی اور یورپ)

Ed. By Elizabeth Humphrys, Guy Rundle and Tad Tietze. Elguta Press, 2011. Pp. 144. ISBN: 9780787058805.

''اسلاموفوبیا'' یا ایک عام اصطلاح کے مطابق ''مسلمان مخالف نسل پرستی''، اب ریاست کی خدمت گار بن چکی ہے۔ یہ نہ صرف امن کے امریکی نظریے (Peace Americana) کی خصوصیات رکھتی ہے بلکہ نوفسطائیوں اور دائیں بازو کے شدّت پسند جنونیوں کی ایک پوری اکثریت بشمول ناروے کے اندرس بری وک (Anders Breivik) جیسے قتل عام کرنے والوں کی تقویت کا

باعث بنتی ہے۔ تاہم اسلام کا، جو کہ اس گفتگو یا مباحثے کا اہم ترین موضوع ہونے کے ساتھ ساتھ اسی طرح کے تنفر اور برگشتگی کا ہدف ہے، کسی مذہبی روایت یا مسلمانوں کے کسی تاریخی طبقے سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔ بلکہ جہاں اسلام ایک مبالغہ آمیز قسم کا استعارہ، ایک خیالی آسیب، ایک نظریاتی خوف، ایک من گھڑت سازش، ایک افسانوی دشمن کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، وہاں ایسا کرنے والے فرد کا مقصد صرف اور صرف نسلی تطہیر ہوتا ہے اور اس ذہنیت کا نتیجہ قتل اور نفرت پھیلانے جیسے جرائم کی صورت میں نکلتا ہے۔ اسلاموفوبیا سے مراد اخلاقیات کے جامے میں ملبوس ایک ایسا درندہ ہے جو انسانوں کے کسی بھی سماجی، مذہبی یا ثقافتی طبقے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ جو اپنے نام نہاد خوابوں یا تصورات کی تکمیل نسلی تطہیر جیسے بھیانک جرائم کے ذریعے کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور دہشت و دروغ گوئی جس کی بقا کے ضروری اجزاء ہوتے ہیں۔ سچائی اس کے نظریاتی پرچار کا پہلا شکار ہوتی ہے، اور دلیل و انسانیت جیسے تصورات اس کی تحریر و تقریر میں کوئی گنجائش نہیں رکھتے۔ خوش قسمتی سے یہاں جتنے بھی موضوعات یا علمی و تحقیقی کاوشیں زیر غور لائی گئی ہیں، وہ اس حقیقت کو واضح کر دیتی ہیں کہ نہ تو حقائق کی اصل دنیا، نہ اخلاقیات کی مشترک دنیا، نہ فلسفۂ وجودیت کی منطق، نہ کوئی سیاسی استدلال، نہ کوئی علمی تحقیق و تفتیش اور نہ کوئی منطقی تجزیہ اس قسم کے من گھڑت بیانات کی توثیق کر سکتا ہے۔

غارت گری کے لیے اس کی پکار پر کوئی بھی کان دھرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ جہاں کہیں بھی ذہانت اور انسانی ہمدردی کا کوئی عنصر موجود ہوتا ہے، جہاں پر بھی سیاسی بقا کی کسی منطق کا ہماری فلاح و بہبود سے کوئی تعلق ہوتا ہے، جہاں بھی ایک پرامن مستقبل کے حوالے سے کسی کا کوئی مفاد موجود ہوتا ہے، وہاں پر انسانیت کے مشترکہ خواب کو شرمندۂ تعبیر ہونے سے نہیں روکا جا سکتا۔ ایک نسل کا اختلاط سے پاک ہونا، یا کسی عقیدے کی سچائی، یا تہذیب کی برتری، مکافاتِ عمل پر مبنی انصاف کا تقاضا بلاشبہ ایسے اہداف ہیں جن کی پیروی اس صورت میں ہرگز مناسب نہیں ہے، کہ اس کی قیمت نسل کشی کی صورت میں ادا کرنی پڑے۔ مناسب طریقے سے تنقیدی جائزہ (اجزاء کو الگ الگ کر کے) کیا

جائے تو اسلاموفوبیا خود کونسل پرستی پر مبنی ایک ایسے اصول کی صورت میں عیاں کرتا ہے، جس کے فلسفۂ ہستی کو ماسوائے دہشت وقتل وغارت کے اور کسی سیاسی تصور سے اخذ نہیں کیا جا سکتا۔

بلاشبہ، اسلاموفوبیا کو یورپ اور امریکہ میں دائیں بازو کے انتہا پسندوں کے معاصر نظریے کے طور پر اس مستشرقیت سے، جو کہ بقول ایڈورڈ سعید، نوآبادیاتی نظام کے عروج کے دور میں طاقت اور تسلط کے مباحث کا نام تھا، لازماً الگ کر کے دیکھنا چاہیے، اس کے باوجود فلسفۂ شرق کے تذکرے یا حکایت کی حدود میں رہتے ہوئے اس کے ماخذ کے سُراغ کے حوالے سے پائیدار بنیادوں پر تفتیش کرانے کی معقول وجوہات موجود ہیں۔ ڈیٹرک جنگ (Dietrich Jung) کی انیسویں صدی کے یورپ کی علمی تاریخ پر کی گئی جاں سوز تحقیق، جو کہ ''اسلام'' کے حوالے سے علم کا ایک جدید ذخیرہ تخلیق کرنے کے لیے نظریاتی کوشش پر توجہ مرکوز کرتی ہے، نمایاں طور پر اس طرح کی تفتیش کے لیے موزوں نظر آتی ہے۔ ''مستشرقین، اسلام پسند اور عالمی عوامی حلقہ'' ایک معیاری علمی کاوش ہے، ماخذیا ارتقائی عمل کی بنیاد کا سراغ لگانے کی ایک ایسی جستجو جو تفاصیل اور معلومات سے بھرپور ہے۔ جو اسلام کی ناگزیریت کی تصویر (Essentialist Image) کے منظرِ عام پر آنے کی داستان انتہائی صلاحیت کے ساتھ ازسرِ نو بیان کرتی ہے۔ ہم اضافہ کرتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ اسلاموفوبیا نے استشراق کی کوکھ سے جنم لیا ہے؛ اس کے تمام کھوکھلے دلائل اور یورپ مرتکز جذبات کو اسلام کی ''ناگزیریت'' کے اس تصور سے استحکام حاصل ہوتا ہے، جو کہ استشراق کا تحفہ ہے۔ چنانچہ جنگ کی تحقیق کی علمی غایت اور اس کے محدود تاریخی تناظر سے قطع نظر یہ کاوش اسلاموفوبیا کے حوالے سے ہونے والے کسی بھی مباحثے کے لیے انتہائی موزوں ہے۔

اگرچہ جنگ (مصنف) ایک مخصوص طرزِ تحریر رکھتا ہے، اور اس کی ''اصل'' بصیرت اس قدر اصلیت کی حامل نہیں ہے، جس قدر کہ وہ دعویٰ کرتا ہے، تاہم اس کی کتاب بہت حد تک قابلِ قدر ہے، محض تفصیلات کے اس ذخیرے کی بنیاد پر ہی نہیں جو کہ وہ جرمن بولنے والوں کی علمی دنیا کے منظر کے

حوالے سے فراہم کرتا ہے، جنہیں عام طور پر ایسی کاوشوں میں نظر انداز کر دیا گیا ہے جو اسے انگریزی اور فرانسیسی نوآبادیاتی مہموں کے تناظر میں رکھتی ہیں۔ اس تحقیق کی اہم تاریخی اہمیت خود مصنف کے اپنے قول کے مطابق یہ ہے کہ اگرچہ اس وقت جاری مباحثے میں اسلام اور مغرب کو ایک دوسرے کی مخالف دو انتہائیں قرار دیا جاتا ہے، تاہم، استشراق اور اسلامیت کے مابین ہونے والے مباحث میں ''اسلام'' کی وضاحت یا تعریف ایک ہی طرح سے یعنی ''مکمل نظام'' جس نے ہر چیز کا احاطہ کیا ہوا ہو، کے طور پر کی جاتی ہے! جنگ اپنے طور پر استشراق اور اسلامیت مباحث کے ماخذ کا تعین جدیدیت کے ادراکی طریقِ عمل کے اندر، علم انسانی کے ایک ہی عنوان تلے کرنے کی کوشش کرتا ہے، جیسا کہ وہ اکثر اصرار کرتا نظر آتا ہے، ایک ایسا دعویٰ جو اس کی علمی تاریخ کو عظیم یا برتر نظریے کا اختصار بنا دیتا ہے۔ وہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ اسلام کا جدید علم اس طرح کے جدید زمروں کی وساطت سے اسلامی روایت کی تشریح کر کے تخلیق کیا گیا، جس طرح کہ مذہب، ثقافت، قوم اور تہذیب، ''مرکزی اہمیت کے حامل ایسے تصورات کے ساتھ، مثلاً ارتقائی تاریخ، روایت پرستی اور جدیدیت کے درمیان خلیج (جس کی وضاحت مسلمان دانش وروں نے فقہ کی قانونی اصطلاحات کے مطابق تقلید بمقابلہ اجتہاد کی ہے)، مذہب کی خود اختیاری جدید تعریف.....، یا پھر تعلیم کی مہذب بنا دینے والی طاقت، ہمارا واسطہ اسلام کے حوالے سے اصلاح پسندوں اور نظریہ پرستوں دونوں کی تشریحات سے پڑ چکا ہے، جو کہ بالکل اسی استدلالی ساخت کے اجزاء ہیں جس کے اثرات اسلامی علوم کے حوالے سے ہمارے آباؤ اجداد کی تخلیقات پر بھی مرتب ہو چکے ہیں۔ اس نظریاتی تناظر میں دیکھا جائے تو مختلف شخصیتوں کے حامل ان تمام مصنفین کی تخلیقات جن میں محمد عبدہ سے لے کر سیّد قطب اور ارنسٹ رینان سے لے کر مارٹن ہارٹ مین تک سب آ جاتے ہیں، مذہب اور اسلام پر عمومی جدید بیانیے کے دائرے میں نظر آتی ہیں۔'' (صفحہ ۲۶۴) تاہم جنگ اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ ''مستشرقین اور اسلام پسندوں کی اسلام کے حوالے سے تشریح میں نمایاں ہم آہنگی اس طرح کے شخصی اور علمی روابط کا نتیجہ نہیں ہے جیسا کہ سی۔ ایچ بیکر اور محمد عبدہ، اگنیز گولڈزیہر (Ignaz Goldziher) اور

جمال الدین افغانی، تھامس ڈبلیو آرنلڈ اور محمد اقبال کے درمیان تھے، یا پھر جیسے کرسچن سناؤک ہرگرونج (Christian Snouck Hurgronge)، اور مکہ کے شیخ دہلان کے مابین'' (ص ۵-۲۶۴)۔

ڈیٹرک جنگ کی کتاب اسلام کے اس تصور میں مثالی اہمیت کی حامل تبدیلی کا انتہائی مدلل، بھرپور دستاویزی اور معلومات کی فراوانی کا حامل بیان ہے، جو کہ استشراق کے علمی ڈسپلن کے قیام کے نتیجے میں سامنے آیا تھا اور جسے مختلف وجوہات کی بناء پر اس دور کے بہت سے مسلمان اصلاح پسندوں نے بھی قبول کیا تھا۔ تاہم ہمیں اس جدید عالمی نقطۂ نظر اور اس کے ذہنی رجحانات کی سادہ طریقے سے قبولیت کو ایک عمومی فکری رجحان (Zeitgeist) کے مدّ و جزر سے بڑھ کر کسی بنیادی خاصیت کی علامت کے طور پر اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ ''استشراق بہرحال ایک علمی ڈسپلن سے وسیع تر تصور تھا، اس نے نوآبادیاتی مباحث کے حوالے سے نظریاتی بنیاد فراہم کی تھی۔ استدلال کی حامل ان حکمت عملیوں کی بدولت اس گہری سیاسی مخاصمت کو چھپانا ممکن تھا جو کہ بعد ازاں عیاں ہو کر رہتی تھیں۔ مختصر یہ کہ جنگ کی طرف سے جدید تاریخ کا ایک ''عالمگیر عوامی حلقے'' کے طور پر ظہور اور ایک ''عالمی معاشرے'' کی پیدائش کی صورت میں بیان حد سے زیادہ افسانوی اور آرائشی نظر آتا ہے۔ بلاشبہ مایوس کن طور پر سادہ لوح اور نظریاتی جدیدیت کی خاصیت رکھنے والا منصوبہ اس کے نزدیک مکمل طور پر خیالی تصور اور نجات کے نظریے پر مبنی لفاظی ہے، نہ کہ نوآبادیاتی جنگی منصوبہ اور سفاک سرمایہ داری۔ اس لیے یہ کوئی اتنا حیران کن امر نہیں ہے کہ اس تذکرے میں شدید نظریاتی دشمن مباحثہ کرنے والی ایک ہی انجمن کے ارکان نظر آتے ہیں۔ نہ ہی اس میں کوئی ایسی چیز نظر آتی ہے جو استشراق اور اسلامی نظریات پر مبنی مباحث کی ہم آہنگی یا تناسب و توازن کے حوالے سے انتہائی جدت اور اچنبھے کی حامل ہو۔ اس کی طرف بہت سے علماء، مسلمان اور غیر مسلم دونوں، نے توجہ کی ہے اور اسلامیت کے سیاسی نظریے کو استشراق کی بھونڈی نقالی بھی کہا گیا ہے! مختصر یہ کہ اپنی تمام تر باریکی و پیچیدگی اور عالمانہ عرق ریزی کے باوجود بھی جنگ کے ''تصورات کی تاریخ'' کے اس تناظر میں جو کہ اکادمی اور

مدرسے کی نظریاتی دنیاؤں پر توجہ مرکوز کرتا ہے، تاریخی طور پر دنیا میں طاقتوں کے کردار سے آگہی بھی لازمی ہے۔ یہیں پر ہم دیکھتے ہیں کہ ایرک والبرگ (Eric Walberg) کی "مابعد جدید سامراجیت" (Postmodern Imperialism) ہمارے مباحثے میں داخل ہوتی ہے۔

ایرک والبرگ کی کتاب کا عنوان، اس کا کھرا اسلوب اور بے لاگ سامراج مخالف تناظر اسے یورپین سیاسی صنعتی درجہ بندی (Taxonomy) کے روایتی دائیں اور بائیں بازو کے نظریاتی نقشے میں ایک مخصوص مقام عطا کرتا ہے۔ اس کے باوجود یہ کسی بھی لحاظ سے خشک و بے ثمر نظریاتی مباحثوں پر مبنی ایسی تخلیق نہیں ہے جو کہ دشنام طرازی اور اشتعال انگیز بیانات سے بھرپور، اپنے نظریے کے تحفظ میں راست بازی کی دعوے دار اور اپنے لہجے میں کرختگی کی حامل ہو۔ نہیں، بلکہ یہ جدید تاریخ کا بھی اس قدر سنجیدہ تجزیاتی مطالعہ ہے، جتنا کہ کسی بھی ایسی تاریخ کا جو اس یورپ مرتکز جدیدیت کے عالمی نقطۂ نظر سے برآمد ہوتی نظر آتی ہے جو ایک معروضی تاریخ نگاری کا مفروضہ رواج ہے۔ یقیناً یہ مؤخرالذکر سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس میں عالمی منظر کے اندر طاقت کی حرکیات کو نا قابل لچک توجہ سے نوازا گیا ہے۔ یہ اپنی عالمی تاریخ پر اس طرح توجہ مرکوز کرتا ہے جس طرح کہ یہ غیر متناسب سیاسی روابط، ناہموار اقتصادی تبادلے اور اقتدار کے خود اپنے جواز کے حامل تذکروں کے رنگین گنجلک (prism) میں سے دکھائی دیتی ہے۔ ایک نظریے یا سیاست کے ایک قابل عمل نمونے کے طور پر اس تناظر کی جو بھی حدود و قیود ہوں، جدید تاریخ کی کارگزاریوں کے اندرونی جائزے یا معائنے کے طور پر یہ میرے خیال میں مساوی طور پر جائز اور معقول ہے۔ بلاشبہ، اسلاموفوبیا کی موجودہ لہر کے سیاق و سباق کے اندر ہماری دنیا کی سامراجی ساختوں سے کسی طرح کی غفلت بھی مہلک ثابت ہوگی۔

وہ مروّجہ مباحثہ جس کے مطابق دنیا ایک عالمی گاؤں کی طرح نظر آتی ہے، یعنی "ایک تیار شدہ نظم، اس طرح جیسے انسانی ارتقا ہر زمانے میں منطقی طور پر ہمارے جدید تکنیکی، منڈی کی قوتوں سے تحریک پانے والے ایسے معاشرے کی طرف پیشرفت کر رہا تھا جس پر ایک دولت مند امریکہ کا غلبہ

تھا۔ دنیا میں نظم وضبط پیدا کرنے کے لیے امریکہ کو حد سے تجاوز کرتے ہوئے دفاعی اخراجات کا، دہشت گردوں کو پکڑنے کا، آمروں کے خاتمے اور چین اور روس جیسی ناشکری قوموں کو خبردار کرنے کا بوجھ لازماً اٹھانا پڑے گا تاکہ یہ اقوام اپنی پالیسیاں اس طرح سے وضع کریں جس سے دنیا کو تہذیب یافتہ بنانے کے امریکہ کے انسانیت نواز مقصد کے راستے میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے''، بقول والبرگ، ایک مصدقہ جھوٹ ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہماری دنیا کی سیاسی تعمیر کا نمونہ سامراجیت کا عکاس ہے، اور ریاست بذاتِ خود'' دنیا میں ہونے والی اکثر دہشت گرد کارروائیوں کی ماخذ ہے۔'' ہمارے دور کی جغرافیائی سیاست کا ذکر کرتے ہوئے والبرگ ''عظیم چالوں'' یا گریٹ گیم کی داستان کی طرف لوٹ آتا ہے، جو کہ ایک ایسی اصطلاح ہے جو انیسویں صدی میں روس اور برطانیہ کے درمیان دشمنی کو بیان کرنے کے لیے اختراع کی گئی تھی، اور جو عالمی تسلّط کے لیے سامراجی جدوجہد میں یوریشیا کی مرکزیت کو نمایاں طور پر اجاگر کر دیتی ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ یوریشیا جس کی حدود میں وسطی ایشیا اور مشرق وسطیٰ دونوں آجاتے ہیں، وہ علاقہ ہے جسے باخبر مؤرخ مارشل ہوگسن ''اسلام کی سلطنت'' یا ''دریائے نیل سے لے کر دریائے آموتک کا علاقہ'' بیان کرتا ہے۔ یوں مابعد جدید سامراجیت ہمیں نوسامراجی منصوبے کے مسلمان پہلوؤں سے خبردار کرتی ہے، حتیٰ کہ اگر یہ واضح طور پر اسلامیت-مستشرقیت کی مساوات کے تناسب یا عدم تناسب کو زیر بحث نہیں بھی لاتی۔ بہرحال، اس کا کاٹ دار خلاصہ اس طرح سے تحریر کیا گیا ہے: ''اس وسیع وعریض خطے میں ایک بار پھر اس اسلام کی 'مشترکہ بنیادوں کو دریافت کیا جا رہا ہے' جو اَب سامراجی بازی گروں، یعنی امریکہ اور اسرائیل کے عزائم کی راہ میں مخالفت ومزاحمت کا اہم محرک ہے، جو کہ اس خطے کو مزید ٹوٹ پھوٹ کا نشانہ بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔''

نوآبادیاتی تاریخ، یورپین تسلّط اور ایشیائی مزاحمت وبحالی کا ایک بہت ہی زیادہ جامع اور نمایاں طور پر پڑھنے کے قابل احوال پنکاج مشرا(Pankaj Mishra) کی ''فرام دی روئنز آف دی ایمپائر (سلطنت کے کھنڈرات سے)'' میں دیا گیا ہے۔ یہ نجات کا باعث بننے والی تاریخ اور اس

کی عملی تعبیر کے حصول میں جدیدیت کے منصوبے کے کردار کے یورپ مرتکز تصور کا دلچسپ متبادل پیش کرتی ہے، یہ ثابت کرتے ہوئے کہ کسی طرح، حتیٰ کہ یورپی طاقت کے عروج کے زمانے میں بھی، ایشیائی دانش وروں نے ایک دفاعی اور خودارادیت کے جذبے کے تحت جواب دیا، اور اس عمل کے دوران انہیں نہ صرف اپنے معاشروں کے حوالے سے پریشان کن سچائیوں کا سامنا کرنا پڑا بلکہ اس اقتدار کا نقاب بھی اتر کر رہ گیا تھا جو کہ بلند تر اقدار کا دعوے دار تھا۔ لہٰذا یہ کوئی حیران کُن امر نہیں ہے کہ ''جدیدیت کے بعض انتہائی سُستہ بیان اور ابتدائی ناقدین، جو اس مفروضے کے جواب میں کہ اقتصادی آزادی، انفرادی مفاد اور صنعتی ترقی انسان کے بے پناہ مسائل اور تکلیفات کا مکمل مداوا کر سکتے ہیں، انسانی زندگی کے مفہوم اور مقصد کے حوالے سے خود اپنے ہی روایتی تصورات بروئے کار لا رہے تھے''، ایشیائی تھے۔

اگرچہ مشرا یورپ کے اس عروج کے متبادل احوال کے طور پر جسے عموماً ''تہذیب کی داستان'' کہا جاتا ہے، یورپی آقاؤں کی طرف سے انسانوں کی اس وسیع تعداد پر نوازشات کی بھرمار کا پہلو عیاں کرنے کے لیے کوشاں رہتا ہے، جو کہ جدید منصوبے سے حتمی استفادہ کر رہی ہے، تاہم وہ پھر بھی اس نکتے کو اجاگر کرنے کے حوالے سے خاطر خواہ احتیاط کرتا ہے کہ اس کی تحقیق ''یورپ مرتکز یا مغرب مرتکز تناظر کے مقابلے میں مساوی طور پر پیچیدہ و دشوار ایشیا مرتکز تناظر پیش کرنے کی کوشش نہیں کرتی۔ اس کی نسبت اس کا مقصد یہ ہے کہ ماضی اور حال کے حوالے سے کثیر تناظرات کو عیاں کر دیا جائے، اس امر کو تسلیم کرتے ہوئے کہ مغربی طاقتوں کے مفروضات، جو کہ ناقابل دفاع ہوتے جا رہے ہیں، اب کسی طور بھی برتری یا فائدہ دلانے والے قابل اعتماد عوامل نہیں رہے، بلکہ اُلٹا خطرناک حد تک گمراہ کن بھی ہو سکتے ہیں۔'' شاید ایک ایشیا مرتکز تصور کی تشہیر کے حوالے سے ایک اور پریشان کن حقیقت یہ ہو سکتی ہے کہ جہاں یورپ اس قابل ہے کہ وہ ایک مشترکہ تاریخ کا حوالہ دے سکے اور حتیٰ کہ ایک مشترکہ سیاسی مستقبل کے لیے بھی کوشاں رہے، وہاں ایشیا، ایک عام مستشرقانہ بہتان کے مفہوم کے مطابق، محض ایک جغرافیائی حقیقت کا نام ہی ہے۔ تاریخ سازی یا تاریخ نگاری کا

وہ فکری و اخلاقی بحران جس کا انحصار یورپ/مغرب-غیر یورپ/غیر مغرب کی دوہری بنیاد پر ہے، ابھی تک حل ہونے کے قابل نظر نہیں آتا اور مشرا کو آخر کار یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ''سیاست و معیشت کے مغربی تصورات کا آج کے زمانے میں کوئی قابلِ قبول قسم کا جوابی عالمگیر نظریہ موجود نہیں ہے، اگرچہ یہ تصورات اب دنیا کے اکثر علاقوں میں ہیجان آمیز گھبراہٹ اور خطرناک حد تک ناموافقت کے حامل ہوتے جارہے ہیں'' (صفحہ ۳۰۶)۔ یہ مشاہدہ ان تمام نظریات کے حوالے سے بھی مساوی طور پر معقولیت کا حامل ہے جہاں وضاحت کرنے والی دوہری تقسیم اسلام اور غیر اسلام کے درمیان، مغرب اور باقی ماندہ، اور بلاشبہ ہم اور وہ کے درمیان ہے!

نائن الیون کے وقوعے کے نتیجے میں جب بہت سے آزاد خیال اور بائیں بازو سے تعلق رکھنے والوں کی بڑی تعداد نے اپنے نظریات سے انحراف کو معقولیت کا تقاضا گردانا تو مشرا نے اسلاموفوبیا میں مبتلا گروہ کے بعض انتہائی پرجوش سرغنہ افراد، مثلاً ہچنز، آمس، رُشدی، فرگوسن اور ایسے ہی دوسروں کی بھرپور سرزنش کر کے خود کو باقیوں سے ممتاز رکھا۔ عظیم ذہانت اور فراست کے ساتھ ہی عظیم جذبے اور انسانیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ اس قابل ہو گیا کہ ان کے دلائل کو فسطائیت اور درندگی کی خاصیت کے حامل ثابت کر سکے۔ یہ حقیقت کہ وہ اس قابل تھا کہ ایسی شخصیات پر کیے جانے والے حملوں کی بھرپور مذمت کر سکے جنہیں آسمانِ ادب کے ستارے تصور کیا جاتا تھا، اور وہ بھی اینگلو-امریکن ادبی دنیا کی ان انتہائی باوقار اشاعتوں کے صفحات پر، جیسے نیویارک ٹائمز، نیویارک ریویو آف بکس، دی نیویارک، لندن ریویو آف بکس، دی گارڈین اور اسی طرح کی بے شمار دیگر اشاعتوں میں، اس کے علمی مرتبے اور جوابی دلائل کی صلاحیت کا ایک نمایاں ثبوت ہے۔ تاہم ان تمام تسلیم شدہ خوبیوں اور صلاحیتوں سے بھی زیادہ متاثر کن اس کی انسانیت کا جذبہ و احساس ہے۔ ان سطور کے قارئین، جو ہوسکتا ہے اس کے کام سے اس قدر آگاہ نہ ہوں، انہیں موجودہ جلد سے آغاز کر دینا چاہیے، جس کا تیسرا حصہ نو آبادیاتی ادوار میں مسلم مباحث کے لیے وقف کر دیا گیا ہے، تاہم انہیں مشرا کی اور بے شمار تحریروں کی چھان بین کرنی چاہیے جو کہ نیٹ پر بآسانی دستیاب ہیں، اور جو کہ اسلاموفوبیا

میں مبتلا مریضوں کی اس افترا پردازی کا واضح جواب ہے جو نائن الیون کے بعد ایک اشتعال آمیز شکل اختیار کر گئی تھی۔ ان کو کافی فائدہ ہوگا۔

دہشت گردی کے خلاف جنگ، ایک نہ ختم ہونے والا ایسا جہاد جسے کہ ''دائمی امن کے لیے دائمی جنگ'' کا نام دیا گیا تھا، اور جو بڑھتے بڑھتے دو باقاعدہ جنگوں کی شکل اختیار کر چکی ہے، اذیت رسانی کی نقیب، بے شمار شہری و فوجی اموات کا سبب بننے کے ساتھ ہی انسانیت کے خلاف بھیانک جرائم کا ارتکاب کر چکی ہے، اور اس کے علاوہ اس کے نتیجے میں بے شمار ایسے جارحانہ مباحث جنم لے چکے ہیں جن میں سب سے زیادہ تباہ کن اثرات کا حامل اسلاموفوبیا یا اسلام سے خوف کا مرض ہے۔ سامراجی قتل عام اب انسانی بنیادوں پر مداخلت کے نام پر جاری رہے گا، تاہم ''سرد جنگ سے لے کر دہشت گردی کے خلاف جنگ تک''، رچرڈ سیمور کی دلیل کے مطابق، جو کہ اس نے اپنی، پریشان کن حد تک اس بے لاگ تحقیق میں پیش کی ہے، ''تہذیب و تمدن' اور 'ترقی' کے نوآبادیاتی استعارے ابھی تک آزادانہ نظریات کے عکاس جنگ موافق مباحث کے اہم اجزاء ہیں، اور ابھی تک اسی خونی سیاست کی پردہ پوشی کیے ہوئے ہیں۔ ''قتل کا فراخدلانہ دفاع'' ایک پریشان کر دینے والی کتاب ہے۔ یہ کافی حد تک کھری، اشتعال انگیز اور مناظرانہ قسم کی کتاب ہے۔ نوسامراجی نظام کے حوالے سے معذرت خواہانہ رویہ اپنانے والی ان شخصیات کے نام نہاد تقدیس کے دعووں کا مضحکہ اڑاتی ہوئی جن میں کرسٹوفر ہچنز سے لے کر کنعان مکیہ، مائیکل اگنائیف، پال برمین اور برنارڈ ہنری لیوی تک سب آجاتے ہیں، اور انتہائی بے شرمی سے یہ اعلان کرتی ہوئی کہ ''ایک ایسی جنگ جس میں دس لاکھ سے زیادہ عراقی مارے گئے تھے، وہ 'انسانی بنیادوں پر مداخلت' تھی، امریکی فوج نجات دہندگی کے لیے طاقت ہے، اور دنیا کے امن کو سب سے زیادہ خطرہ اسلام سے لاحق ہے!'' مقصد طاقت کے حاکمانہ مباحث کی منافقت اور اخلاقی دیوالیہ پن عیاں کرنا ہی ہے، جس کو سامنے رکھ کر اس نوجوان (۱۹۷۷ء میں پیدا ہونے والے) اور انتہائی باصلاحیت لکھاری نے ایسی اشتعال انگیز اور ساتھ ہی سرور انگیز قسم کی تحریر لکھی ہے۔ یا پھر جیسا کہ سیمور بذاتِ خود مشاہدہ کرتا ہے، اس ناقدانہ قسم کی تحریر میں

وہ سلطنت کے حوالے سے فراخدلانہ جواز کی تاریخ کو عیاں کر دیتا ہے اور پھر ثابت کرتا ہے کہ ''فتح کی حکمت عملیوں کو، بشمول نسل کشی اور غلامی، کس قدر ظالمانہ طور پر خیراتی مہمات کی تفصیل کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔''

علمی روایات سے انحراف پر، آزاد خیال دانش وروں کی طرف سے نسل پرستانہ سامراجیت سے مصالحت پر اپنے تمام تر غصے کے باوجود، سیمور نے ایک تفصیلی، دستاویزی ثبوت کا حامل اور انتہائی ماہرانہ مدلّل لہجہ اپنایا ہے، جو کہ ایک عالمانہ عرق ریزی کے تمام تقاضوں پر پورا اترتا ہے۔ اس میں بذلہ سنجی اور ظرافت کا عنصر بھی کافی نمایاں ہے: ''اچھا تو امریکہ کی قیادت میں فوجوں نے مسلم ممالک پر دھاوا بول دیا ہے اور اسرائیل نے اپنے عرب ہمسایوں پر بمباری کر دی ہے، دلیل یہ دی گئی ہے کہ درحقیقت مسلمان اور عرب خود ''ہم پر'' حملہ آور ہو رہے ہیں (کیونکہ وہ ہماری آزادی سے حسد کرتے ہیں)''۔ اس طرح سے اظہار کے نئے پیرائے کی شکلیں سامنے آئی ہیں، مثال کے طور پر ''یوریبیا'' اور ''لندنستان''، قدیم یہودی مخالف اصطلاح ''جیو یارک'' کے مساوی! اسی طرح قاری طنز کی ایک عمومی خوراک کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا، جب سیمور ہمیں یہ بتاتا ہے کہ مائیل آگناٹیف، اگرچہ بش کی طرف ہونے کے سبب پریشان یا بے چین سا ہوتا ہے، مگر پھر بھی یہ دلیل دیتا ہے کہ ''سلطنت کے حوالے سے جواز یہ ہے کہ یہ ایسی جگہوں پر، مثلاً عراق، جمہوریت اور استحکام کے لیے یکساں طور پر آخری اُمید بن چکی ہے۔'' اسی طرح سے کرسٹوفر ہچنز کے اس پُرمسرت اعتراف پر اظہار خیال کرتے ہوئے جب وہ کہتا ہے کہ (مسلمان) دہشت گردوں کو مارنا ''ایک فرض اور ذمہ داری'' ہے اور یہ کہ اس کے نزدیک یہ ایک ''لطف'' بھی ہے اور ایک ایسا فریضہ جو کہ کسی بھی لحاظ سے ''وحشت ناک'' نہیں ہے، سیمور درج ذیل ردِّعمل کا اظہار کرتا ہے:

کیا یہ ضروری ہوگا کہ آزاد خیالی کو تباہ کر دیا جائے تاکہ اُسے بچایا جا سکے؟ یہ بالکل اس طرح کی صورت حال ہے کہ آزاد خیالی کے پیروکاروں کو اس طرح کی نامعقولیت کا شکار ہوتا ہوا دیکھا جائے

اور پھر بھی وہ خود کو آزاد خیال یا حتیٰ کہ بائیں بازو کے دانشور کہلاتے رہیں؛ تاہم ان کی طرف سے یہ دعویٰ کہ انہیں اس طرح کرنے پر ''دشمن'' نے مجبور کیا ہے اور ساتھ ہی یہ شکایت بھی کرنا کہ یہ سفید فام کے کندھوں پر محض ایک اور بوجھ تھا، تو پھر یہ بلاشبہ خود استہزائی کا ایک بے مثال انداز ہے۔ ایک مانوس قسم کی قلبی ماہیت کی بدولت، اس وقت آزاد خیالی کے پیروکاروں اور نوقدامت پسند فلسفیوں کی طرف سے مسلمانوں کے لیے جس بدیہی عدم برداشت، تعصّب اور مخاصمت کا مظاہرہ کیا گیا اس کی ایک واضح طریقے سے عکاسی اسلامی عدم برداشت، تعصّب اور مخاصمت کے حوالے سے کی جاتی ہے۔ صورت حال کو اس طریقے سے اجاگر کر کے دکھانا..... سامراجی نظام کا ایک کلاسیکی وصف ہے، اس کی انتہا درجے کی بربریت کے نمونوں سمیت۔ (ص ۱۹)

سیمور کی تحقیق نظریاتی مناظروں اور حساب برابر کرنے کے حوالے سے ایک زبردست عالمانہ تخلیق ہے۔ اس کے باجود یہ اپنے اخلاقی دائرے سے ہرگز باہر نہیں نکلتی اور کہیں پر بھی مضحکہ خیز نقالی نہیں بن جاتی۔ یہ اس حقیقت کی عکاسی بھی کرتی ہے کہ بائیں بازو کا سامراج مخالف دانش ور، ''جسے ترقی کے دشمنوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کی بدولت خطاوار ٹھہرایا گیا ہے''، بادشاہ کی ضیافت میں شمولیت کے مقصد کے حصول کے حوالے سے ضرورت سے زیادہ ذہین اور انسان دوست ہوتا ہے! اسلاموفوبیا کے بے آواز مظلوموں کو اس بات پر لازماً شکرگزار ہونا چاہیے کہ یہ خاموش رہنے سے انکاری ہے۔

اسلاموفوبیا پر علمی تحقیق عام طور پر اسے عملی تجربے پر مبنی اور باضابطہ وجوہات کی بنیاد پر مسترد کر دیتی ہے۔ کیا مسلمان نمایاں ہوتے ہیں؟ ایک ایسا ہی جواب ہے جسے کہ اس سماجی قسم کے تناظر کو نظرانداز کر دینے، اگرچہ مکمل طور پر مسترد نہ کرنے، کے باعث تحریک ملی ہے، جہاں اسلام کے جدّت مخالف، لادین مخالف، آزاد خیالی کے نظریات پر مبنی سیاست اور طرزِ زندگی مخالف ہونے کے مبینہ رجحان اور مسلمانوں کی معاصر عالمی نظام سے مطابقت پیدا کرنے پر نارضامندی کی وضاحت کا معاملہ درپیش ہوتا ہے۔ مصنف اپنے قارئین کو یہ یاددہانی کراتا ہے کہ اگرچہ اس کی کتاب اس حوالے

سے کوئی واضح جواب فراہم نہیں کرتی اور وسیع تر صورتِ حال کی محض جزوی وضاحت کرتی ہے،'' تاہم یہ اہم سوالات کی خاصی تعداد کو زیرِ غور لاتی ہے اور ٹھوس ثبوتوں کے ساتھ تجزیہ کرتی ہے۔'' بلاشبہ وہ خود کو یہ نکتہ اُجاگر کرنے پر مجبور محسوس نہیں کرتا کہ یہ کتاب ''جو کہ تعصب سے پاک اور سیاسی راستی کے تقاضوں سے آزاد ہے'' مسلمانوں کے حوالے سے ان مفروضات کو زیرِ بحث لاتی ہے جو عصرِ حاضر کے سلگتے ہوئے عوامی مباحثے کا حصہ ہیں،'' مفروضہ حقائق کے طور پر نہ کہ اٹل سچائیوں یا غیر منصفانہ غلط بیانیوں کے طور پر''۔

مختصر یہ کہ ''کتاب'' کا مقصد ''مباحثے کا رُخ گرما گرم اور لفظی نوک جھونک سے موڑ کر حقائق کی دریافت اور مفروضات کی آزمائش کے عمل کی طرف کر دیا جائے۔''

بلاشبہ، کم سخنی اور سیاسی راستی کی خصوصیات اس کے کام میں کبھی بھی نمایاں طور پر ظاہر نہیں کی گئیں، اگرچہ اس میں موزوں خصوصیات کے حامل یا آزمائشی جملے جا بجا ملیں گے، جس طرح کہ دستیاب اعداد و شمار کی حدود و قیود اور اُن کی موزونیت کی چھان پھٹک ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ نہ ہی کوئی موضوع محض اس لیے چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ حساس نوعیت کا ہے۔ مذہبی رجحان، رواداری، بدعنوانی، جرائم، سیاسی تشدّد، دہشت گردی، سماجی علوم، مساوات اور جمہوریت جیسے سارے موضوعات کا جائزہ بڑی جرأت سے لیا گیا ہے، اور نتائج کو بڑی صاف گوئی سے سامنے لایا گیا ہے۔ مصنف ایک سخت گیر قسم کا عملی تجربے کا طریقہ کار اپناتا ہے۔ اس کی کتاب کا ایک تہائی سے زائد مواد جدولوں، خاکوں اور اعداد و شمار کی دیگر شکلوں پر مشتمل ہے۔ مختصر یہ کہ یہ تخلیق طریقہ کار کی عرق ریزی سے پیروی کرنے یا عالمانہ سالمیت پر کسی طرح کا سمجھوتہ نہ کرنے کے حوالے سے انتہائی دیانتدارانہ کوشش کی نمایاں مثال نظر آتی ہے۔ اس لیے اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے کہ ہم میں سے اکثر کے لیے اس کے نتائج اِن دلائل کے حق میں ہرگز نہیں جاتے جو مسلمانوں کے حوالے سے اسلام کے خوف کے دعووں کو استحکام عطا کرتے ہیں، دوسرے معنوں میں مذہب کے ساتھ وفاداری (یعنی جنون پسندی)، مذہب

اور سیاست کو یکجا کر دینا (لادین مخالف)، ''مذہبی قیادت'' کو ترجیح، تشدد کی طرف رجحان (دہشت گردی)، منحرف رویے کے لیے عدم برداشت وغیرہ وغیرہ۔ جہاں کہیں تضادات نظر آتے ہیں تو ان کی مقداری حوالے سے کوئی اہمیت نہیں ہے، یا پھر یہ مسلمانوں کے حق میں جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر فش کے مطابق، ''سماجی سرمائے کے حوالے سے ہمیں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کوئی خاص فرق نہیں ملتا۔ مسلمان غیر مسلموں کی نسبت ذرا زیادہ میل ملاپ کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں میں مختلف شعبۂ ہائے زندگی کے لوگوں کے ساتھ وقت گزارنے کا ذرا زیادہ رجحان پایا جاتا ہے۔ تاہم یہ فرق اتنا اہم نہیں ہے۔'' (صفحہ ۱۰۳) یہ پہلو فش کی تحقیق کے عمومی موضوع کی طرف مناسب رہنمائی کرتا ہے، اگرچہ طریق عمل کے حساب سے دلیرانہ اور بنیادی عنصر کا حامل، تاہم نتائج کے حساب سے محتاط، یقیناً غیر وابستہ اور ہر طرح کی سنسنی خیزی سے احتراز کرتا ہوا۔ واحد قابلِ ادراک، بلکہ قابلِ مشاہدہ فرق صنفی تعلقات کے حوالے سے ہے، جہاں مسلمان معاشرہ تاریخ کے ساتھ رفتہ رفتہ عدم توافق کا حامل ہوتا چلا گیا ہے۔ تاہم یہ امر بمشکل ہی حیران کن ہے، اگرچہ اس قابل ضرور ہے کہ اسے اسلاموفوبیا میں مبتلا مریضوں پر نسل پرستانہ الزامات عائد کیے بغیر زیر بحث لایا جائے۔

بدقسمتی سے شماریاتی تجزیہ اور عمرانیاتی طریقہ عمل معیاری یا مخصوص رواجوں پر مبنی سوالوں کا ہمیشہ حل پیش کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ چنانچہ عملی تجربات پر مبنی اپنے تمام تر شواہد، طریقہ کار یا ضوابط کی سختی سے پیروی اور عالمانہ سالمیت کے باوجود، ہوسکتا ہے کہ فش کی تحقیق ان لوگوں کو قائل کرنے میں ناکام رہے جو دہشت گردی کے جواز کے طور پر اسلاموفوبیا کو ایک نظریہ قرار دیتے ہیں۔ محققین، ماہرین تعلیم اور دوسرے کشادہ ذہن دانشوروں کو فش کی تحقیق یقیناً بصیرت افروز بھی لگے گی اور مسحور کن بھی۔

جان آربووین کی ''اسلام پر دشنام طرازی'' (Blaming Islam) بھی ایک ایسی ہی تحقیق

ہے جو شخصی نوعیت کی جوابی دلیل کو علمی رنگ میں پیش کرتی ہے۔ یہ ایک مختصر مگر انتہائی پرسکون انداز میں پیش کردہ ایسا جواب دعویٰ ہے جس کا مقصد ''اس حقیقت کو عیاں کرنا ہے کہ بعض مخصوص قسم کی بدگمانیاں جو کہ اسلام کے خوف میں اضافہ کررہی ہیں، محض بدگمانیاں ہی ہیں۔'' اسلام پر الزام، اس کے مصنف کے خیال میں، ایک ایسی 'بلند بانگ قسم کی' صنعت بن چکی ہے جو کہ اعتدال اور معقولیت پر مبنی ہر آواز کو دبا دینے کے خطرے کی حامل ہے۔ بلاشبہ یہ ان سب کو خاموش کرا دے گی ''جو اکثر مسلمانوں کے مقاصدِ حیات کی عام اور معقول نوعیت اور ان کے اپنے عقیدے کے فہم پر اعتراض کرنے کے خواہشمند ہیں۔'' بووین ہمیں یاددہانی کراتا ہے، اسلام پر ''انتہائی دائیں بازو کے نظریات کی مقبولیت'' کی طاقت کے بل پر حملہ، اور کثیر ثقافتی سیاست ساتھ ساتھ چلتے ہیں، اور یہ کہ ''معقولیت پسندی عقیدے یا نظریے کی فراخدلانہ تشریح کا نام ہے''، امریکہ اور یورپ دونوں میں۔ ان دعووں کا جواب دیتے ہوئے بووین چار ایسے دعووں کا تجزیہ کرتا ہے جو مغرب میں اسلام کے حوالے سے خوف و ہراس کی موجودہ لہر کا محرک ہیں: ''یہ کہ یورپین حکومتوں نے ایسی کثیر ثقافتی پالیسیاں وضع کی ہیں جو مسلمانوں کو وسیع تر معاشرتی دھارے میں شمولیت سے روکنے کا سبب بن چکی؛ یہ کہ کسی بھی صورت میں مسلمان تارکینِ وطن مغرب سے علاحدہ اور اس کے مخالف ہی رہیں گے؛ یہ کہ ان تمام رجحانات کے خطرے کا مشاہدہ سب سے زیادہ برطانیہ میں کیا جاسکتا ہے، جہاں بڑے پیمانے کا کثیر ثقافتی رجحان شریعت کے قانون بننے کا سبب بن چکا ہے؛ اور یہ کہ شریعت غافل قسم کے عدالتی منصفین (ججوں) کی بدولت امریکہ میں بھی تیزی سے سرایت کرتی جارہی ہے''، بووین اپنے دعوے کو بغیر کسی تنبیہ کے عیاں کرتا ہے، ''ہر ایک مفروضہ اصول غلط ہے''۔

اس کے نتیجے میں جو سبق حاصل ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ سوچ واضح ہونی چاہیے، جذبات پُرسکون ہونے چاہییں، استدلال پیش کرنے اور نظریے پر یقین کا رجحان ہونا چاہیے تاکہ قائل کیا جاسکے نہ کہ بحث جیتی جاسکے۔ چنانچہ اس ذمہ داری کے حوالے سے پہلا قدم یہ ثابت کرنا ہے کہ وہ جو کثیر ثقافتی نظریے کو نشانہ بناتے ہیں، بظاہر جان بوجھ کر، ثقافتی تنوع کی سماجی حقیقت کو حکومت کی تارکین وطن

کے حوالے سے بنائی گئی پالیسیوں کے ساتھ گڈمڈ کر دیتے ہیں اور پھر معیاری یا مروّجہ سیاسی نظریات کے حوالے سے سارے کے سارے معاملے کو الجھا کر رکھ دیتے ہیں۔ بووین انتہائی وضاحت کے ساتھ ثابت کرتا ہے کہ نقل مکانی اور انضمام کے حوالے سے یورپی ریاستوں کی پالیسیاں کثیر ثقافتی فلسفوں کی بنیاد پر تشکیل نہیں پاتیں۔ اگر ان کا کوئی مقصد ہے تو وہ یہ کہ ایسی حکمتِ عملیوں کو اپنایا جائے جو کہ ''تنوع کو تسلیم کرنے اور اسے مخصوص زاویے سے ہر قوم کی خاصیت کو اُجاگر کرنے والے انداز کو طویل المیعاد بنیادوں پر برقرار رکھنے'' کے عمل کی علامت ہوں۔ واضح طور پر یہ ایک ثقافتی (دوسرے لفظوں میں لسانی اور نسلی) ریاستی پالیسی کی عکاسی کرنے والا وہ کثیر ثقافتی نظریہ ہے جو کہ مسلمان مخالف اشتعال کو ہوا دیتا ہے۔ بعض اوقات ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ ثقافتی یا علاقائی شناخت کا نتیجہ دریافتوں کی صورت میں نکلتا ہے۔

مثال کے طور پر، بووین مالی غبن کے ایک ایسے واقعے کا تذکرہ کرتا ہے جس میں بھارت سے تعلق رکھنے والے سرمایہ کار ملوث تھے، اور جس کی تشہیر وسیع پیمانے پر ایک فرقہ وارانہ طرزِ فکر کے طور پر کی گئی۔ یہ حقیقت کہ یہ لوگ جو کہ ہارورڈ اور وہارٹن جیسے اداروں کے سند یافتہ اور گولڈ مین ساچز (Goldman Saches) اور میکنزی جیسے اداروں میں کام کرتے رہے تھے، ایک مشترکہ نسلی/قومی پس منظر رکھتے تھے، بطور ثبوت ان کے حق میں اور خلاف بھی جا سکتی تھی۔ تاہم کیا یہ حقیقت کہ وہ بھارتی پس منظر رکھتے تھے اس واقعے کے حوالے سے انتہائی اہمیت کی حامل تھی یا ان کی بڑے پیمانے کی پیشہ ورانہ سرگرمیوں اور مجرمانہ طرزِ عمل کے حوالے سے دوسرے عوامل اہم تھے؟ بووین کی رائے میں، کثیر ثقافتی نظریے کو کوسنا یا موردِ الزام ٹھہرانا ''اس لیے فائدہ مند ہوتا ہے کہ یہ فائدہ مند بھی ہے اور ساتھ ہی گمراہ کن بھی۔'' مقبولیت پسند پالیسیوں میں اسلام کو غلط کہا جاتا ہے، کیونکہ یہ حکمتِ عملی ''ثقافتی قوم پرستی کے خواہش مندوں کے لیے آسان شکار فراہم کر دیتی ہے۔''

بووین اصرار کرتا ہے ''فرنچ نیشنلسٹ فرنٹ سے تعلق رکھنے والے سرکوزی اور میرین لی پن

کے لیے سڑکوں پر نماز پڑھتے ہوئے نمازیوں کو برا بھلا کہنا یقیناً آسان ہے، بہ نسبت اس کے کہ ان کے لیے خاطر خواہ تعداد میں مساجد بنادی جائیں۔''

بووین کی کتابوں میں سے انتہائی بصیرت افروز وہ ہے جو برطانیہ میں شریعت کونسل کے مبینہ کردار پر روشنی ڈالتی ہے۔ وہ اصرار کرتا ہے کہ ان کونسلوں کو قانون سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی، کیونکہ ان کا کام مصالحت کرانا ہوتا ہے، یا پھر ازدواجی جھگڑوں اور طلاق کے معاملات میں قانونی کے بجائے مذہبی مشورہ دینا۔ ''ان کا مقام دیوانی قوانین کے دائرے سے باہر، بلکہ بالاتر ہوتا ہے۔'' حتیٰ کہ اس مشاورتی دائرے کے اندر بھی ان کا کردار محدود ہوتا ہے، باوجود اس کے کہ ''کونسل کے ارکان بہت سے معاملات میں اسلامی قانون کے حوالے سے رائے دے سکتے ہیں، مگر وہ بچے کی تحویل یا اثاثوں کی تقسیم کے حوالے سے کوئی فیصلہ نہیں سناتے۔''

بووین اس نکتے پر بھی اصرار کرتا ہے کہ ''ان کونسلوں کے حوالے سے خبردار کرنے کے لیے ذرائع ابلاغ کی کبھی کبھار کی کوششوں کے باوجود قانونی حلقوں میں زیادہ تر لارڈ فلپس کی مثالوں کی پیروی کی جاتی ہے، انہیں مسائل کے حل کے حوالے سے معقولیت پر مبنی تسلیم کرتے ہوئے۔''

اس مباحثے سے اگر کوئی نکتہ اُجاگر ہوتا ہے تو وہ یہ ہے کہ برطانیہ میں شرعی قانون کی کونسلوں کی موجودگی سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ برطانوی قانونی نظام بہت مستحکم ہے، یا پھر اینگلو-سیکسن قانونی روایات عملیت پسندی پر مبنی ہیں۔ تجسّس کی حد تک، بووین بتاتا ہے کہ اس طرح کی بعض خصوصی عدالتیں امریکہ اور کینیڈا میں بھی منظرِ عام پر آسکتی ہیں، جہاں کہ اینگلو-سیکسن قانونی ورثے کے آثار ابھی باقی ہیں، ''ہماری توقع بجا طور پر یہ ہے کہ فرانس میں ان کا بہت کم ہی تصور کیا جاسکے گا، جہاں پر قانون مفروضہ طور پر مشترکہ اقدار کی عکاسی کرتا نظر آتا ہے۔ ریاستی اداروں سے باہر شادی کی رسوم ادا کرنے کا مطلب وہاں یہ سمجھا جاتا ہے کہ آپ نے ایک شہری کے طور پر اپنے فرائض ترک کردیے ہیں اور ایک غیر سرکاری فرد کے روبرو شادی کی مذہبی رسومات ادا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا

ٹھکانہ جیل ہے۔ اس صورتِ حال کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم اسلاموفوبیا کے مریضوں سے جو کم سے کم توقع رکھ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ انہیں برطانوی قانون کی اپنے مقابلے میں منصفانہ ہونے کی کوشش سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے۔

اسلاموفوبیا اب سیاست اور اخلاقیات کے حوالے سے ہونے والے ہر ایک مباحثے میں اہم موضوع کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ یہ علمی حلقوں کا بھی اتنا ہی من پسند موضوع ہے جس طرح کہ یہ اقتدار کے ایوانوں میں تیزی سے جگہ پا رہا ہے۔ بلاشبہ، یہ ایک جھنجھناہٹ (یا بھیرویں راگ) ہی ہے جو کہ معاصر عالمی سیاست اور سامراجی جنگوں کی ہر قسم کی موسیقیت کے لیے پس منظر کی موسیقی کی فراہمی کا ایک دائمی ماخذ ہے۔ یہ بمشکل ہی اتفاقی یا حادثاتی ہے، اگرچہ انتہائی دردناک، اس لیے کہ ڈرون ہمارے عہد کا ایک امتیازی نشان بن چکا ہے۔

ڈرون کے کردار کی ہمارے دور کے سیاسی عقیدے کے بنیادی محور کے طور پر ایک روشن وضاحت یا مثال احمد رشید پیش کرتا ہے، جو کہ اس کی تنصیب کا ایک ابتدائی واقعہ یوں بیان کرتا ہے: ''۵ اگست کو پاکستانی طالبان کا ایک طاقتور ترین اور انتہائی بے رحم سالار بیت اللہ محسود جنوبی وزیرستان میں امریکی میزائل حملے کی زد میں آکر ہلاک ہو گیا۔ میزائل کا نشانہ بنتے وقت وہ گردوں کی ایک بیماری کے علاج کے لیے رگ کے اندر دوا سرایت کرنے کے مرحلے سے گزر رہا تھا، اور اپنی نوجوان دوسری بیوی کے ساتھ اپنے سسر کے گھر کی چھت پر لیٹا ہوا تھا۔ دن کے کوئی ایک بجے کے قریب سی آئی اے کے ایک خودکار قسم کے ڈرون سے چلایا جانے والا میزائل اس کے گھر کو چیرتا ہوا آ گرا، اس کے جسم کے دو ٹکڑے کرنے کے ساتھ ہی اس کی بیوی، اس کے والدین اور سات عدد محافظوں کو ہلاک کرتے ہوئے (دی نیویارک ریویو آف بکس، ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۹ء)۔ واقعہ سنانے والے کے مطابق ''(محسود کی) موت پاکستان میں انتہاپسند رہنماؤں کے خلاف جنگ کی پہلی بڑی کامیابی تھی''، مگر دوسروں کے نزدیک یہ واقعہ ''ایک غیر متناسب جنگ'' کی نوعیت اور ''ضمنی نقصان'' کی حقیقت کو بڑی بے دردی

سے آشکار کرتا ہے، ایک ایسا سامراجی کارنامہ جو کہ اسلام کے خوف پر مبنی مباحثے کا جزو لازم ہے۔

''ڈرون طیاروں کے سائے تلے'' ایک ایسی علمی کاوش ہے، جو کہ ڈرون کے ذریعے لڑی جانے والی ''جنگ'' کی تکنیکی تفصیلات کے حوالے سے تو کچھ نہیں بتاتی، تاہم اس غارت گر مشین کے باعث پیدا ہونے والے دُکھوں اور تکالیف کے حوالے سے بہت کچھ بتاتی ہے۔ مضامین کے اس مجموعے میں، جو کہ شہزاد بشیر اور رابرٹ ڈی کریوز نے بڑی محنت اور سلیقے سے جمع کیے اور متعارف کرائے ہیں، بہت سے محققین نے اُس مروجہ مباحثے کو درست تناظر عطا کرنے کی کوشش کی ہے جو کہ مؤلفین کے نزدیک ''سادہ لوحی پر مبنی، نادرست اور بہت حد تک غیر انسانی قسم کا ہے۔'' وہ یہ شکوہ بھی کرتے ہیں کہ ''سرحدی علاقوں کی حد سے زیادہ جنگی قسم کے مناظر کی بنیاد میں تاریخ کے ایک انتہائی جانبدارانہ اور متنازعہ مطالعے کا عنصر کارفرما نظر آتا ہے۔'' تناظر، دوسرے لفظوں میں، فیصلہ کن اہمیت کا حامل ہے اور حقیقی عزم یہ ہے کہ افغانستان- پاکستان کے سرحدی علاقوں کے حوالے سے از سرِ نو سوچ بچار کرنے کے منصوبے کو آگے بڑھایا جائے۔ تاہم اس امر کو تسلیم کر لیا گیا ہے کہ چونکہ افغان-پاکستان علاقہ مناسب طور پر ریاستی اداروں میں ضم (مکمل طور پر نوآبادیت کا حصہ، ان کے اپنے اظہار بیان کے مطابق) نہیں کیا گیا، لہٰذا مضامین فراہم کرنے والوں کو ''تحقیقی تجزیے کی حتمی اکائی کے طور پر قومی ریاست کی اصطلاح کے مروجہ استعمال کے حوالے سے بڑی جانکاہی کرنی پڑی تھی۔'' اس طرح کی وابستگی کے باوجود، انفرادی مصنفین اس حوالے سے واضح قسم کے ابہام کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ عالمی نظام یا علمی مباحث میں اس کا جو بھی جواز موجود ہو، حتمی تجزیے کی اکائی کے طور پر ریاست کی اصطلاح کا استعمال، کم سے کم اس علاقے کے لیے، اگرچہ نظریاتی تنازع کا معاملہ نہ سہی، مگر پھر بھی تصوراتی مشکلات سے پُر نظر آتا ہے۔ ان تمام محدودیتوں کے باوجود، یہ ایک بہت ہی معلومات افزا اور مفید مجموعہ ہے۔ پھیلاؤ یا تسلسل کے حساب سے وسیع اور مواد کے حوالے سے اکثر و بیشتر ادراک اور خیال کو روشن کر دینے والا۔ یہ امر انتہائی طمانیت کا باعث ہے کہ اس خطے کے لوگوں کو، جن کے اپنے خیالات و آراء کا عالمی مباحث میں مکمل طور پر فقدان ہے، کم سے کم ''اپنے ایماء پر اظہارِ

خیال کے لیے'' کچھ مستند علمی آوازوں کا سہارا تو ملا ہے۔ اس کتاب کا مقصد ان کے نظریے کی حمایت کرنا نہیں ہے، تاہم یہ ہمیں ان کی حالتِ زار کو سمجھنے میں ضرور معاونت فراہم کر سکتی ہے۔ یہ کسی بھی ایسے فرد کو پڑھنے کی سفارش کی جا سکتی ہے جو کہ اس خطے میں اور یہاں پر جاری تنازعات کے پُر امن اختتام میں دلچسپی رکھتا ہو۔

ایک (بُری) سوچ اور (بُرے) عمل کے درمیان، اسلاموفوبیا کے مباحثے اور نسل کشی کی سیاست کے درمیان انتہائی قریبی ربط کا بڑی بے رحمی سے مظاہرہ ۲۲ جولائی ۲۰۱۱ء کو اس وقت دیکھنے میں آیا جب اندرس بریوک (Anders Breivik) نے شیطان صفتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ناروے کے نوجوانوں کا قتل عام شروع کر دیا، جن میں سب سے کم عمر نوجوان صرف ۱۴ برس کا تھا۔ تین ماہ کے اندر اندر ''آن یوٹویا'' کی موجودہ جلدوں کا ذخیرہ ختم ہو گیا، نہ صرف اس لیے جیسا کہ ایڈیٹر ہمیں یاد دہانی کراتا ہے ''تا کہ یوٹویا کے ہلاک شدگان کو خراجِ تحسین پیش کیا جائے اور اس امر کو یقینی بنایا جائے کہ ان اموات کو دائیں بازو کے نظریات کے ان پیروکاروں کی طرف سے کوئی اور عنوان دینے یا نظر انداز کرنے کا معاملہ نہ کر دیا جائے جو کہ انسانیت کے کسی مشترکہ احساس کے فقدان کا شکار ہو چکا ہے''، بلکہ بنیادی طور پر ''ایسے نفرت آمیز اور غلط بیانیوں کو سوچے سمجھے طریقے کے تحت جنم دینے کے عمل کو بھی خبر دار کر دیا جائے جو کہ اس طرح کی سیاست کو ہوا دیتے ہیں۔'' تاہم یہ کتاب ''نہ تو یورپ میں مسلمانوں کی عمومی حالتِ زار کے بارے میں ہے اور نہ ہی اسلاموفوبیا کے وسیع اور پیچیدہ وقوع کے بارے میں ہے'' کیونکہ اس طرح کے فریضے کی تکمیل کے لیے ایک زیادہ ضخیم، کثیر مآخذ کی حامل، اور بلاشبہ کثیر جلدوں پر مبنی کتاب درکار ہو گی۔ اس کے بجائے ''یہ بائیں بازو کے نمائندوں کی جانب سے بائیں بازو کی سمت بڑی تعداد میں مارے جانے والوں کے واقعے کے جواب میں سیاسی وجوہات کی بناء پر لکھی گئی، نفسیات کے اندر تحلیل ہو جانے کی کوشش، جرائم کے حقیقی زمرے کے اندر، کسی بھی چیز کے اندر تحلیل ہو جانے کی کوشش، ماسوائے سیاست کے، ان کی یادداشت کی تذلیل ہے، اخلاقی اصولوں سے حقیقی انحراف۔''

یہ انتہائی صاف گو اور ہمدردی کے جذبوں سے پُر قلم کاروں کے ایک گروہ کی طرف سے اب تک عیاں کیے گئے انتہائی مؤثر اور ہلا کر رکھ دینے والے خیالات کا مثالی نمونہ ہے، جن کی اکثریت آسٹریلیا سے تعلق رکھتی ہے، جو کہ بائیں بازو کے علمی اور اخلاقی معیار پر پورے نہیں اُترتے۔ اس موضوع سے، جس کا میں نے ناروے اور سویڈن کی زبانوں سمیت چھ زبانوں میں جائزہ لیا ہے، دور کا بھی واسطہ رکھنے والی کوئی ایسی چیز، کوئی بھی ایسا نکتہ میرے ذہن میں نہیں آتا جو کہ ان کے چبھتے ہوئے تجزیوں اور سیاسی بصیرت سے، ان کے انسانی احساسات اور سماجی دُکھوں سے، ان کی علمی و ذہنی تابندگی اور اخلاقی رفعتوں سے ذرا بھی مماثلت رکھتا ہو۔ میرے پاس سوائے اظہارِ تشکر کے اور کوئی بھی الفاظ نہیں ہیں! اس جریدے کا مطالعہ کرنے والا کوئی بھی شخص اس تحریر کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ یہ سیاسی بصیرت اور سماجی ہمدردی کے جذبات پروان چڑھانے، دہشت کے سیاسی مفہوم کا فہم حاصل کرنے اور اسی کسی المیے یا آفت میں تبدیل کر کے نہ رکھ دینے کا سبق ہے۔

ناروے میں منظرِ عام پر آنے والے جرائم کے بھیانک پن کے علاوہ اس امر کا ادراک کہ ''معاصر دنیا میں دہشت کی نوعیت پر ایک زیادہ حقیقت پسندانہ غور و فکر'' کو بڑے پیمانے کے ذرائع ابلاغ اور مقتدر سیاسی حلقوں کی جانب سے جان بوجھ کر نظر انداز کیا جا رہا تھا، فوری ردِّعمل میں انتہائی نمایاں نظر آتا تھا۔ جو چیز تواتر کے ساتھ محسوس کی جا رہی تھی، جیسا کہ اس جلد کے مدیران کی طرف سے ظاہر کی گئی، وہ یہ تھی کہ ''جب سے ۲۲ جولائی ۲۰۱۱ء کے واقعات رونما ہوئے ہیں، تب سے یوٹویا کی اہمیت کم ہونے کے ساتھ ہی یہ پس منظر میں جا چکا ہے، اور نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ مغرب کے نام پر ایک دلدوز حرکت کی گئی، ان کے خلاف جو اسلام کے لیے انتہائی ''نرم گوشہ'' رکھتے تھے، اور بائیں بازو پر ایک غیر مبہم حملے کو وسیع تر سیاسی تناظر سے اوجھل کر دیا گیا۔ اس کے باوجود یوٹویا اور بریوک کا مکمل مفہوم اس وقت سامنے آتا ہے جب ان کو یورپ میں اسلاموفوبیا اور شدّت پسند دائیں بازو کے عروج اور نائن الیون کے واقعات منظرِ عام پر آنے کے وقت سے بائیں بازو کی کردار کشی اور ان کے خلاف تناؤ کی حکمتِ عملی کے تناظر میں زیرِ غور لایا جائے۔''

''ان واقعات'' کی تفصیلات فراہم کرنے کے علاوہ، اس مجموعے میں 'یورپین تمہید' اور 'عالمی ماحاصل' کے تجزیے اور مباحث شامل ہیں۔ ان موضوعات پر ہونے والا مباحثہ، مثلاً اسلاموفوبیا، دائیں بازو کی دہشت کی تاریخ، دہشت گردی کے خلاف جنگ میں بائیں بازو کا کردار، فسطائیت، اسرائیل اور شدت پسند دایاں بازو اور بریوک کا یہودیت مخالف نظریہ آنکھیں کھول دینے والا ہے، بالکل اس طرح جیسے مقتدر حلقوں کی جانب سے اسے سیاست سے پاک کر دینے کی، نامعقولیت کے اندر پناہ حاصل کرنے کی کوشش کر کے اخلاقی ذمہ داری سے فرار کی تمام حکمتِ عملیاں، یا پھر زبان، تشدد اور سیاست کے حوالے سے زیادہ عمومی نتیجہ اور اس کے ساتھ ہی آسٹریلیا میں نفرت کے فروغ کے حوالے سے زیادہ وسیع تناظر کا حامل مباحثہ وغیرہ، ایک زیادہ منصفانہ استدلال اور مستحکم غور و فکر کے متقاضی ہیں۔ مسلمانوں کے لیے عالمی سطح پر سامراج کا از سرِ نو ظہور نیستی کے راج کے مترادف ہو چکا ہے۔ دونوں ہی اپنی تباہی کے عمل میں ماہر اور ایک ایسی دہشت کا روپ ہیں جو دور سے مسلّط ہوتی اور اوپر سے نازل کی جاتی ہے۔

(ترجمہ: اعزاز باقر)

Source: The Muslim World Book Review, 33:I, 2012